ایک چابک ہے جو وہ پٹڑی سے اترنے والوں کے رسید کرتا ہے۔اسی چابک کا خوف معاشرے کو راہ راست پر رکھتا ہے(۱)۔

مذکورہ موضوع پر مختلف ادباء نے اپنے اپنے پیرائے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے مثلاً ''یہ کہنا دشوار ہے کہ جب پہلا انسان دنیا میں تن تنہا تھا تو اور اس کا کوئی ہم نفس نہ تھا تو کیا وہ ہنستا تھا۔لیکن جب رفتہ رفتہ انجمن رونما ہوگئیں اور تمدن ترقی کرتا گیا تو موجودات کے ساتھ گوناگوں مصنوعات اور تہذیبی لوازمات بھی پیدا ہوگئے۔جس سے تفریح وتفنن کے مظاہر کی توقع کی جاسکتی ہے۔ابتداء میں حالات کیا تھے اور یہ مظاہر کس طرح نمودار ہوئے۔اس کے بارے میں زیادہ تر قیاس ہی سے کام لیا جاسکتا ہے جہاں تک تحقیق ساتھ دے سکے اس کے خطوط واضح کیے جاسکتے ہیں(۲)۔

انسانی سوچ جب ظریفانہ انداز اختیار کرتی ہے تو کہیں طنز، کہیں مزاح، کہیں بذلہ سنجی تو کہیں تحریف جیسی کیفیت ظہور میں آتی ہیں جیسا سماج ہوتا ہے۔ ویسی ہی ظرافت کی شکلیں ہوتی ہیں۔ ابتدامیں انسان نے اپنے احساسات کو اشاروں میں ادا کرنا شروع کیا ان اشاروں میں دیگر ضرورتوں کے علاوہ خوشی، انبساط اور ظرافت بھی کہیں کہیں پائی جاتی تھی۔عموماً تخلیقی فنکار سماج کے مختلف زاویوں اور کیفیتوں کا اظہار کرتے ہیں جو کم وبیش یکساں ہوتا ہے۔

سفرنامہ ایک بیانیہ صنف ہے اور سفرنامہ نگار اپنے مشاہدات، تاثرات اور تجربات کو تحریر کرتا ہے سفرنامہ نگار جن چیزوں کو دیکھتا ہے ان میں ادب، مذہب، محبت، نفرت، بھوک، افلاس، خوشحالی غرض کہ زندگی کے ہر شعبے کے دونوں پہلوؤں کو دیکھتا ہے سفرنامہ نگار کی تحریریں تقابلی مطالعے کا ایک عمومی وصف ضرور رکھتی ہیں۔عطاءالحق قاسمی ہمارے عہد کے نامور مزاح نگاروں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں انھوں نے مشتاق احمد یوسفی جیسے بلند پایہ مزاح نگار کی موجودگی میں اپنا ایک راستہ نکالا اور خود کو منوایا یہ ان کی تخلیقی، طنزیہ اور مزاحیہ قوت اور صلاحیت کا بیّن ثبوت ہے۔عطاءالحق قاسمی کے سفرنامے طنز ومزاح کی چاشنی لیے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے انھیں زندگی اور سماج دونوں کا مطالعہ اور مشاہدہ بلکہ موازنہ کرنے کا بھی غیر معمولی طور پر موقع ملا جس کا اظہار ان کے سفرناموں میں جابجا نظر آتا ہے۔عطاءالحق قاسمی مزاح نگاری میں ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ پاکستان کی ستر سالہ ادبی تاریخ میں ایسی نابغہ روزگار شخصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے اُردو ادب کو بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں باوقار بنایا۔آج ہمیں اُردو ادب میں جملہ اصنافِ ادب بڑی زرخیز نظر آتی ہے اور روز بروز نئے نئے تجربات اور امکانات نے ان کی زرخیزی میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ستر کی دہائی میں لکھنے والوں کی جونئی کھیپ اُردو ادب میں داخل ہوئی ان میں ایک نمایاں نام عطاءالحق قاسمی کا ہے جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں مزاحیہ شاعری سے کیا اور پھر مختلف اخبارات ورسائل میں مختلف ہلکے پھلکے موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہونے لگے حتیٰ کہ اورینٹیل کالج کی طالب علمی کے زمانے میں کالج کے ادبی مجلّے ''محور'' کی ادارت بھی ان ہی کے حصے میں آئی(۳)۔

موجودہ دور میں عطاءالحق قاسمی اُردو ادب میں بڑے مرتبے پر فائز ہیں۔آپ بہ یک وقت مزاح نگار، کالم نویس، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار، ڈرامہ نگار، شاعر، مدیر، اور پاکستانی ٹیلی ویژن کے جنرل منیجر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔زیرِنظر مقالے میں عطاءالحق قاسمی کی مزاح نگاری اوراس کے سماجی پس منظر کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے مزاح نگاری کی حوالے سے یہ ایک ہمہ جہت مصنف ہے البتہ یہاں ان کے سفرناموں کو مدِنظر رکھتے ہوئے سماجی روّیوں اور ناہمواریوں سے تخلیقی سطح پر ابھرنے والے جوہر کو بازیافت کرنے کی سعی کی گئی ہے جس سے حظ اٹھانے کے بعد نہ صرف ادب پارے کی معنویت میں اضافہ ہوگا بلکہ قاری کو مصنف کے مشاہدے اور تجربات میں شریک ہونے کے نئے مواقع میسر آئیں گے۔سفرنامہ ایک غیر افسانوی صنفِ ادب ہے لہذا افسانوی ادب کے برخلاف اس میں سماج کے زیادہ نتھرے روّیے نظر آتے ہے مزاح ان روّیوں کے کھردرے پن کو قابلِ قبول بناتا ہے لہذا مزاح کے حوالے سے ہونے والی تحقیق فکر کے پیچیدہ دھاروں کو عمومیت کی پوشاک پہنا کر قاری تک اس کی رسائی آسان بناتی ہے۔اب تک ان کے درجِ ذیل سفرنامے منظرِعام پر آچکے ہیں۔

۱۔	خندِ مکرّر	۱۹۸۳ء
۲۔	شوق آوارگی	۱۹۹۰ء
۳۔	دل دوراست	۱۹۹۵ء
۴۔	گوروں کے دیس میں	۱۹۹۹ء
۵۔	ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور	۲۰۰۷ء
۶۔	دنیا خوبصورت ہے	۲۰۰۹ء

عطاءالحق قاسمی ایک زندہ دل، لطیفہ سنج، جملے باز اور منچلے انسان ہیں۔ان کے سفرنامے ''شوق آوارگی'' سے ہی ان کی افتادِطبع کا اندازہ ہوجاتا ہے جس میں انھوں نے امریکہ کے سماجی رویوں کو طنز وتضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ان کے سفرناموں میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایسی جگہ کے حالات لکھ رہے ہیں جہاں پہنچ کر لوگ مرعوب اوراحساس کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں بلکہ اکثر مقامات پر وہ ایک فاتح کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جو ایک مفتوحہ علاقے کی سیر کو نکلا ہے۔اس سفر کے دوران کس زاویہ نظر سے وہ سماج کو دیکھتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

> ''یہاں بے شمار سیاحوں کا ہجوم تھا اوران کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں تھا بلکہ شوق سیاحت انھیں دنیا کے مختلف خطوں سے کھینچ لایا تھا تاہم ان میں سے صرف چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور کاغذ پر لگے انگوٹھی کی طرح چپٹی ناک والے جاپانی یا سیاہ رنگ نیگرو الگ پہچانے جاتے تھے ورنہ ایک نظر دیکھنے پر سبھی انگریز لگتے تھے۔ان

سب کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں، کلچر مختلف تھے۔ ان کا لباس ایک سا تھا یا پھر بحیثیت انسان کے جبلتیں یکساں تھیں۔ سیاحت کے دوران یہ دوسری یکساں خصوصیت میری توجہ کا خاص مرکز رہی چنانچہ نیویارک کے ٹائم اسکوائر پر میری ملاقات نارمن نامی شخص سے ہوئی تو پہلی ملاقات میں وہ مجھے نارمن ہی لگا مگر تیسری یا چوتھی ملاقات میں یہ عقدہ کھلا کہ یہ نارمن دراصل بھاٹی گیٹ کا عبدالرحمٰن ہے بلکہ انسانی برادری کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے اس میں محبت، نفرت، مسرت اور غم کے جذبات بھاٹی گیٹ کے عبدالرحمن سے کسی طرح بھی مختلف نہیں تھے بہر حال یہاں دنیا کے سبھی خطوں کے لوگ موجود تھے(۴)۔''

ان کے سفر نامے ''گوروں کے دیس'' میں پاکستانی قوم جو بیرونِ ملک آباد ہو کر اپنی اقدار سے دور ہو گئی اُسے طنز کا نشانہ بنایا ہے:

''پاکستانیوں کی نئی نسل''

میری ملاقات برطانیہ میں پیدا ہونے والے پاکستانیوں کی نئی نسل سے بھی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک حجاب سا حائل ہو چکا ہے اور وہ ہمارے ساتھ گھلنے ملنے میں زیادہ آسانی محسوس نہیں کرتے۔ دراصل ان کی تربیت ایک بالکل مختلف معاشرے میں ہوئی ہے اور شاید ہم لوگ اپنے عمل سے انکی تربیت کرنے کے بجائے اپنی زبان سے ان پر نکتہ چینی زیادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا یورپ اور امریکہ وغیرہ میں مقیم پاکستانیوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ان بچوں پر انگلیاں نہ اٹھائیں۔ نیز اپنی روحانی اور ثقافتی برتری اپنی زبان سے بیان کرنے کے بجائے اپنے عمل سے ثابت کریں تو یہ چیز ان کے ذہنوں پر زیادہ اثر انداز ہوں گی۔ نیز جو پاکستانی اپنے دین اور کلچر کے ضمن میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتے۔ انھیں چاہیئے کہ وہ بچوں کے سنِ بلوغت تک پہنچنے سے پہلے پاؤنڈ اور ڈالر کو ٹھوکر مار کر اور ہر قسم کے مسائل کے مقابلے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر اپنے لوگوں کے درمیان واپس آ جائیں۔ انھیں سچی خوشیاں اور سچے غم وہیں ملیں گے(۵)۔''

ان کا سفر نامہ ''دنیا خوبصورت ہے'' ایک شاہکار تصنیف ہے اس میں بھی سماجی اقدار کی منظر کشی کی گئی ہے کیونکہ

ایک ادیب جب سیاحت کے لیے نکلتا ہے تو اس کے پیش نظر کئی باتیں ہوتی ہیں وہ ہر طرح کے خیالات اور واقعات کو صفحہ قرطاس پر لانے کی شعوری کوشش میں مصروف ہوتا ہے اور مزاح نگار سماج میں بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور دیگر ہنگامہ خیزیوں پر لطیف انداز میں طنز و تضحیک کرتا ہے۔ مثلاً بحری جہاز میں پیش آنے والے واقعے کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''میرے سامنے والی نشست پر ایک ستر پچھتّر سال کی امریکن مائی بیٹھی تھی جس کے ہونٹوں پر شوخ لپ اسٹک ہے، گلے میں ہار اور کانوں میں بندے بھی ہیں بالکل سہاگن لگتی ہے۔ ہمارے ہاں اس عمر کی خاتون اگر کسی روز صابن سے منہ بھی دھو لے تو کہا جاتا ہے اماں تمہاری عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے، یہ تم کن چونچلوں میں پڑ گئی ہو اور اگر استری شدہ جوڑا پہن لے تو ''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' والا محاورہ اس کا منتظر ہوتا ہے(۶)۔''

سفر کے دوران ایک واقعہ مذہبی حوالے سے بھی پیش آیا جیسا کہ تبلیغ کے سلسلے میں اکثر واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں:

> ''قریباً ایک گھنٹہ سمندر کی سیر کرنے کے بعد جہاز واپس ساحل پر آیا ہم گیٹ سے باہر نکلتے ہیں تو ایک جاپانی مبلغ پمفلٹ تقسیم کرتا نظر آتا ہے۔ ایک پمفلٹ مجھے بھی ملتا ہے۔ اس کا عنوان ہے یسوع مسیح تم سے محبت کرتا ہے یقیناً اس میں کوئی کلام نہیں کیونکہ سارے پیغمبر اپنے خدا کے علاوہ انسانوں کی محبت سے بھی سرشار تھے۔ لیکن کاش کوئی مسلمان مبلغ بھی وہاں کھڑا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری خطبے کا متن تقسیم کر رہا ہوتا تو آج کی مہذب دنیا کو پتہ چلتا کہ عام انسانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ غلاموں اور لونڈیوں تک کے لیے آواز حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اٹھائی تھی لیکن ہمارے مبلغ ان دنوں لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے بجائے انھیں خارج کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔'' وہ بہت مصروف ہیں۔ جب انھیں فرصت ملے گی وہ یقیناً اس طرف بھی توجہ دیں گے(۷)۔''

عطاءالحق قاسمی صاحب کے سفرناموں میں طنز و مزاح کا ایسا انداز پایا جاتا ہے جو قاری کے لیے تفریحِ طبع کا باعث ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان حقائق سے بھی پردہ اٹھاتے جاتے ہیں جسے بیان کرنے کے لیے جرات مندی اور بلند حوصلہ کی ضرورت ہے۔ قاسمی صاحب اپنے سفرنامے ''خندمکرر'' میں پبلک ریلیشنگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پبلک ریلیشنگ کا فن غالباً بہت پرانا ہے اور فرض کریں اگر یہ اتنا پرانا نہیں تو

اسے پرانا ہونا چاہیے تھا۔ اگر یہ فن پرانے زمانے میں بھی اتنا ہی مقبول ہوتا جتنا ان دنوں ہے تو لوگ بہت سی قباحتوں سے بچ جاتے مثلاً سکندر اور پورس میں لڑائی کی نوبت ہی نہ آتی بلکہ اس کی جگہ یوں ہوتا کہ ان دونوں سورماؤں کے پبلک ریلیشنگ آفیسر اپنی اپنی کاروائیوں کا آغاز کرتے پھر ان میں سے جو بول بچن کا زیادہ ماہر ہوتا وہ اپنے باس کو وکٹری اسٹینڈ پر کھڑا کر دیتا اور اس کے صلے میں پبلک ریلیشنگ آفیسر کو بھی دو چار انکریمینٹس اکٹھی مل جاتیں اور خلق خدا بھی چین کی بانسری بجاتی۔ اس سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی والے خاصے زیرک نکلے انھوں نے تاجروں کے روپ میں اپنے پبلک ریلیشنگ آفیسر انڈیا بھیجے اس کے نتیجے میں کمپنی بہادر نے رفتہ رفتہ پورے برصغیر کو اپنا آفس بنا لیا(۸)۔''

عطاءالحق قاسمی کا یہ وصف انھیں دیگر مزاح نگاروں میں ممتاز کرتا ہے کہ یہ اپنی سیاحت کو وسعت نظر اور حسِ مزاح کے ذریعے سماجی برائیوں کو بڑے سلیقے سے بیان کر جاتے ہیں۔ ''خندمکرر'' میں گداگری کو جس طرح پیش کیا گیا ہے ایک منفرد انداز ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''گزشتہ روز ہمارے ایک دوست دو پہر کے وقت گھر میں آرام فرما رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی وہ آنکھیں ملتے ہوئے نیچے آئے دروازہ کھولا تو سامنے ایک فقیر کھڑا دانت نکال رہا تھا۔ ہم نہیں جانتے اس وقت ان کا ردعمل کیا تھا لیکن واقعہ بیان کرتے وقت وہ آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ ہم نے کہا ابھی حوصلہ نہ ہاریں کہ مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں۔' بولے کیا مطلب؟ عرض کیا کہ پورا معاشرہ ماڈرن ہو رہا ہے، فقیر بھی اس معاشرے کے معزز رکن ہیں۔ آج انھوں نے گھنٹی بجا کر آپ کے سامنے دست سوال دراز کیا ہے کل وہ ٹیلی فون پر بھیک مانگیں گے، زمانہ ترقی کرتا چلا گیا تو بات دروازے کی گھنٹی اور ٹیلی فون تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ معزز فقیر وفد کی صورت میں شرفاء کے پاس جایا کریں گے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد حسب ضرورت مالی امداد حاصل کر کے لوٹیں گے(۹)۔''

ان کے بارے میں کئی نقادوں نے اپنے تجزیے پیش کیے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر فوزیہ چوہدری نے اپنے زاویہ نظر سے لکھا ہے کہ:

''عطاءالحق قاسمی تو بنیادی طور پر ہیں ہی مزاح نگار لہٰذا ان کا لکھا ہوا سفرنامہ مزاح

کے عنصر سے کیسے مبرا رہ سکتا ہے۔ انھوں نے سفرنامے میں طنز و مزاح کا ایسا ادبی زاویہ نکھارا ہے جس میں مزاح بے حد لطیف اور طنز سبک ہے۔ وہ کسی مربوط موضوع کا احاطہ کیے بغیر باتوں باتوں میں قاری کی حس مزاح کو متحرک کرتے ہوئے اس میں اصلاح کا رویہ پیدا کرتے ہیں(۱۰)۔''

لذت کام و دہن پر جب نظر کی تو معاشرتی تضاد کو خاطر میں لائے اور ذو معنویت کے ذریعے وہ پہلو بآسانی بیان کر گئے جو ہمارے ہاں رائج ہے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے جب گروپ لیڈر نے دوسرے ساتھیوں کو کھانے سے ہاتھ کھینچنے اور ہوٹل میں منعقدہ شوز کی طرف متوجہ ہونے کے لیے کہا تو عطاءالحق قاسمی نے خیال کو کہاں سے کہاں جا ملایا۔ مثلاً:

''لیکن کھانے سے ہاتھ کون کھینچتا ہے؟ ہم لوگوں کو تو حکومت الٹانے سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی کھانا کھلنے پر میزیں الٹانے سے ہوتی ہے جو لوگ حکومت میں ہوتے ہیں یہ ہم لوگوں کی غلط فہمی ہے کہ انھیں حکومت سے دلچسپی ہے۔ ان کی دلچسپی بھی صرف کھانے سے ہوتی ہے۔ اپوزیشن والے بھی ان کی حکومت الٹانے کے اتنے شوقین نہیں ہوتے بلکہ وہ بھی کھانے کی میز پر اپنی باری کے منتظر ہوتے ہیں(۱۱)۔''

عطاءالحق قاسمی نے اپنی شعوری کوشش کے ذریعے سماجی رویوں اور سیاستدانوں پر طنز کے وار کیے ہیں وہ بلا خوف و خطر معاشرتی المیے پر تضحیک کرتے ہیں تاکہ قاری اس مضحکہ خیزی میں لوگوں کا اصل چہرہ دیکھ سکے اور یہ اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زندگی مختلف احساسات و اعمال کا مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے ''اُردو ادب میں سفر نامہ'' میں اپنے تحقیقی موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے ''مزاح نگاروں کے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ:

''عطاءالحق قاسمی مزاح میں دھیمے رنگوں کو اس قدر شوخ کر دیتے ہیں کہ ان کی کرچیاں آنکھوں میں چبھنے لگتی(۱۲)۔''

یہ صاحبِ طرز ادیب ہیں انہوں نے دنیا بھر میں کئی ممالک کی سیر و تفریح کے بعد جو بھی ادب پارہ تخلیق کیا اس میں وسعت نظری خوب رہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے وطن سے عقیدت و محبت فراموش نہیں کرتے بلکہ اپنی قومیت کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ مثلاً فوزیہ چوہدری اس بارے میں لکھتی ہیں کہ:

''ان کے سفرناموں میں جغرافیائی معلومات کے ساتھ ساتھ قاری کو حالات و

واقعات سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے اور شگفتگی کے باعث اکتاہٹ کا احساس بھی نہیں ہوتا اسی خصوصیت کے باعث عطاءالحق قاسمی سفرنامہ نگار کی حیثیت سے کامیابی کے کئی منازل طے کر چکے ہیں۔ یورپ، امریکہ اور انگلستان کے سفرناموں میں عطاءالحق قاسمی جہاں بے فکرے سیاح دکھائی دیتے ہیں وہاں پیش منظر بدلتے ہی ان کا طرز احساس بھی بدل جاتا ہے۔ وہ ایک ذمہ دار، محب وطن اور اسلامی جذبہ اخوت سے معمور پاکستانی نظر آتے ہیں (۱۳)۔''

سفرنامہ ''دلی دور است'' ان کی طرزِ نگارش کا بہترین مرقع ہے جس میں مصنف نے بھارت کی سماجی، ادبی اور تہذیبی زندگی کا نہایت نزدیک سے مشاہدہ کیا ہے بلکہ وہاں کی زندگی کو ہر زاویے سے دیکھتے ہیں۔ اس سفرنامے میں وہ کئی مقامات پر جذباتی دکھائی دیتے ہیں جو ان کا فطری انداز ہے۔ مصنف جب امرتسر کے اس محلے میں پہنچتا ہے جہاں اس کا گھر تھا تو ایک متاثر کن اور والہانہ پن تحریر میں آجاتا ہے۔ وہ اس مقام پر لکھتے ہیں کہ:

''میں اپنے آبائی گھر کے سامنے کھڑا تھا یہ وہ گھر تھا جہاں میری پیدائش ہوئی تھی جہاں اباجی نے مجھے گڑھتی دی تھی اور میرے کان میں اذان دی تھی۔ یہاں اب ایک سردار جی رہتے تھے انھوں نے بے حد گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ یہ تین منزلہ گھر تھا ہمارے گھر والے اس کے قصیدے پڑھا کرتے تھے۔ اس گھر کی وسعت اور کشادگی کی داستانیں بیان کیا کرتے تھے اب ہم آٹھ بہن بھائی علیحدہ علیحدہ کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور ان کی تنگ دامانی کے شاکی ہیں تو کیا ہمارے دل اطمینان سے خالی ہو چکے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ خدائی یاد سے خالی دلوں میں بے اطمینانی کے دیو قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس گھر کے مکینوں کے دل نور سے بھرے ہوئے تھے وہ کشادہ دل تھے اور انھیں اپنے گھر بھی کشادہ لگتے تھے۔ یہ گھر واقعی روشن اور کشادہ تھا، ہم تنگناؤں اور اندھیروں کے مکین اس روشنی اور کشادگی کا اندازہ کیسے کر سکتے ہیں (۱۴)۔''

مزاح نگار چونکہ حساسیت کے ساتھ سفر کرتا ہے لیکن کبھی کبھی جذباتیت کا عنصر بھی تحریر کا حصّہ بن جاتا ہے کیونکہ جب کسی سرزمین سے گہری وابستگی ہو تو جذباتیت کا عنصر غالب آجاتا ہے۔ وہاں کے شہر، گلی کوچوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے اپنائیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے سفر کے دوران چند حقائق اور دہرے معیار کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے جس کی مثال ملاحظہ کیجیے:

''اس سفرنامے میں جا بجا ایسے فقرے ملتے ہیں جس سے سیکولر ہندوستان کا پول کھل جاتا ہے۔طنزیہ فقروں کی مثال اس وقت سامنے آئی جب حیدرآباد میں سیمیورنا ہوٹل میں مصنف اور ضمیر جعفری کھانے کی میز پر آ کر بیٹھتے ہیں تو ویٹر پوچھتا ہے۔'' ویجیٹیرین یا نان ویجیٹیرین' ویٹر نے پوچھا؟انڈیا میں ہر جگہ کھانے سے پہلے یہ سوال پوچھا جاتا ہے یعنی آپ سبزی خور ہیں یا گوشت خور حالانکہ سبزی خور اور گوشت خور کے ساتھ آدم خور بھی پوچھنا چاہیے کہ مذہب کے نام پر انسانوں کا خون پینے والے بہت ہیں۔(۱۵)''

ہجرت کے سفر کو کئی ادیبوں نے موضوع بناتے ہوئے اپنے اپنے انداز میں اظہار خیال کیا ہے کیونکہ یہ سفر اپنی ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے جس میں لاکھوں مسلمانوں نے قربانیاں دی ہیں جہاں لہو سے سینچی ہوئی سرحدیں ہوں وہاں ہمیشہ ان مٹ نقوش ہوتے ہیں اور جب ہم ماضی کی تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو جذباتی کیفیت خود بخود طاری ہو جاتی ہے ایک ایسے ہی واقعہ کو جذباتی انداز میں قاسمی صاحب نے بھی پیش کیا ہے۔

''کسی بھی ملک کی آزادی کے لیے دی گئی قربانیوں کا صحیح اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو واقعی جسمانی اور ذہنی کرب سے گزرے ہوں۔قاسمی صاحب بھی ایسے حالات سے گزرے ہیں لہذا وہ بھی حالات وواقعات کے بہترین عکاس ہیں جیسا کہ:''میں نے تین چار سال کے ایک پیارے سے بچے کو گود میں اٹھایا اور اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا بیٹے !تم تو معصوم ہو، یہ کنویں بھی معصوموں کی لاشوں سے بھرے ہوئے ہیں اگر تاریک طوفانی راتوں میں تم ان کنوؤں کی چیخیں سنو تو ان پر کان ضرور دھرنا ہم یہ امانتیں تمہارے بڑوں کے بجائے تمہارے سپرد کر رہے ہیں کہ بچے اس دنیا میں خدا کے سفیر ہوتے ہیں (۱۶)۔''

ہماری تہذیب وتمدن اور سماجی اقدار کی صورتحال پر جس طرح سبک طنز کیا ہے اس کے لیے بلند حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے عطاءالحق قاسمی کا کمال یہ ہے کہ جب طنز کے کاٹ عروج پر پہنچتی ہے تو مزاح کے ذریعے اسے دھیرے دھیرے اپنے مطالب ومقاصد تک لے آتے ہیں۔اس ضمن میں اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں کہ:

''ہمارا سب سے بڑا تہذیبی المیہ یہ ہے کہ سماجی برائیوں کے تمام تنکے ہماری آنکھوں کا شہتیر بن چکے ہیں۔خوشی اور غمی کے مواقع پر رائج ہو جانے والی لایعنی روایات کو ہم مقدس گائے سمجھ کے پوجے جا رہے ہیں۔شعوری جانچ اور پرکھ اور

تنقیدی بصیرت، ہماری اراضی جہالت اور ازلی بھیڑ چال کے حق میں مکمل طور پر
دست بردار ہو چکی ہیں (۱۷)۔''

سرسید احمد خان نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں جس طرح اصلاحی ادب تخلیق کیا اور مقصدیت کی ترویج بھی کی انھوں نے اپنے مقالوں میں فرسودہ رسم ورواج کو طنز کا نشانہ بنایا اور معاشرے کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں کو طنز ومزاح کے پیرائے میں تحریر کیا ہے ان میں بھی مقصدیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔

''ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور'' میں سماجی تناظر کو جس انداز میں پیش کیا ہے ڈاکٹر سلیم اختر ان کے بارے میں رقم طراز ہیں۔عطاء الحق قاسمی نے پاکستان (جس سے اسے بے حد پیار ہے) اور پاکستانیوں کو ایک پاکستان کی نہیں بلکہ غیر ملکی کی غیر جانبدار آنکھ سے دیکھا اور یہی کام مشکل کام ہے اس لیے کہ ہم جس معاشرے میں زیست کرتے ہیں اس سے Conditioning کی وجہ سے ہم اس کے داخلی تضادات اور افراد کی کرداری بوالعجمیوں کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں بلکہ ہم تو خود بھی ایک کردار ہوتے ہیں لہذا سطح سے نیچے تہ میں اتر کر معاشرہ کی درست تفہیم آسان نہیں ہوتی۔ یہ صرف طنز نگار ہی بطریق احسن اس نوع کا خارجی مشاہدہ کرسکتا ہے اور وہ طنز نگار اگر عطاء الحق قاسمی ہو تو سونے پہ سہاگہ والی بات درست ثابت ہوتی ہے(۱۸)۔''

''ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ ءلاہور'' کے ذریعے پیروڈی میں جدت کی نئی مثال قائم کی ہے نثر نگاری میں یہ ان کا کمالِ فن ہے بلکہ اس تخلیق کو پیروڈی کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے اس سفرنامے میں سماج میں پائی جانے والی ان تمام خامیوں ،خرابیوں اور ناہمواریوں کو طنز وتضحیک کے ذریعے سماج کے چہرے کی گرد کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اسے اپنا عکس دکھائی دے سکے۔عطاء الحق قاسمی اس سفرنامے کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

''ان دنوں جو ادیب بیرون ملک جاتا ہے وہ واپسی پر سفرنامہ ضرور لکھتا ہے اس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ جو غیر ملکی پاکستان آتے ہوں گے واپسی پر وہ بھی یقینا ایک آدھ سفرنامہ ضرور قلمبند کرتے ہوں گے جس طرح ہمارے ہاں کے بعض سیاح کسی غیر ملک میں گزارے ہوئے چند گھنٹوں سے ہی اس کی پوری تہذیب اور تمدن کا کچا چٹھا کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اس طرح ممکن ہے کہ بعض غیر ملکی سیاح بھی سپر ایکسپریس پر پاکستان کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اپنے قارئین کو

پاکستانی عوام اور یہاں کی معاشرت کے بارے میں فیصلہ کن معلومات فراہم
کرتے ہوں۔سوہم نے چشم تصور میں ایک ایسے غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ ملاحظہ کیا
ہےجس نے چندروز لاہور میں قیام کیا(۱۹)۔''

عطاءالحق قاسمی کے مشاہدے اور تجزیے میں بہت باریک بینی ہے۔اس سفرنامے میں بہت سے موضوعات تحریر کیے ہیں جوسماج کی عکاسی کرتے ہیں۔مثلاً:

''عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے کے باعث یہاں سالا ایک گھٹیا چیز اور بہنوئی ایک آسمانی چیز سمجھی جاتی ہے۔تاہم ہرشخص جو یہاں بہنوئی کے مرتبے پر فائز ہے وہ بیشتر صورتوں میں کسی نہ کسی کا سالا بھی ہوتا ہے۔چناں چہ یہاں ہرشخص کی آدھی زندگی بطور بہنوئی اور آدھی بطور سالے کے گزرتی ہے۔ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہاں داماد کوتو سرآنکھوں پر بٹھایا جاتا ہےلیکن گھرداماد کے ساتھ بڑا حقارت آمیز سلوک ہوتا ہےواضح رہے داماد وہ ہوتا ہے جولڑکی کو بیاہ کرلایا ہوتا ہےاور گھر داماد وہ ہوتا ہے جسےلڑکی بیاہ کرلاتی ہے(۲۰)۔''

ان کی انفرادیت دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ جس عینک سے انھوں نے معاشرتی اقدار کواور عوام کو سمجھا ہے وہ معاشرے سے کس قدر جڑے ہوئے ہیں انھوں نے کسی بھی چیز کو سطحی طور پر نہیں دیکھا بلکہ معاشرتی معاملات پر جیسا لکھتے ہیں بہت قریبی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ایک ادیب اس نوعیت کے تعلق سے معاشرے میں اہم مقام حاصل کرتا ہے بلا شبہ عطاءالحق قاسمی مزاح نگاری کے ذریعے مسکراہٹیں بکھیرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک لاہوریوں کی شخصیت کا خوبصورت پہلو یہ ہے کہ ان کے چہروں پر ہروقت مسکراہٹ کے پھول کھلے رہتے ہیں۔میں نے انھیں کبھی منہ بسورے نہیں دیکھاوہ ہمیشہ ہنستے مسکراتے نظرآتے ہیں چنانچہ وہ اپنی اس قومی خصوصیت کو بڑے سے بڑے سانحے پر بھی برقرار رکھتے ہیں۔میں نے یہاں کے ایک اخبار میں کسی بڑے المیے پر ایک احتجاجی جلوس کی تصویر دیکھی جس کے نیچے یہ کیپشن درج تھا کہ ''غیض وغضب سے بپھرے ہوئےعوام'' اپنے غم وغصے کا اظہار کررہے ہیں۔اورتصویر میں جولوگ نظرآرہے تھےان میں سے بیشتر کیمرے کی طرف منہ کرکے ہنس رہے تھے۔جس قوم کے افراد بڑے بڑے صدمے کو یوں ہنسی خوشی برداشت کرنے کا قرینہ جانتے ہوں اسے کبھی زوال نہیں آسکتا(۲۱)۔''

عطاءالحق قاسمی کی مزاح نگاری عصرِ حاضر میں شہرت رکھتی ہے کیونکہ یہ اپنی تحریروں میں مزاح کے تمام حربے استعمال کرتے ہیں جس سے قاری محظوظ ہوتا ہے اور حالات و واقعات سے بھی باخبر رہتا ہے۔ایک ادیب کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ معاشرتی مسائل کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تدارک کا بھی اقدام کرے یا متعلقہ احباب تک پیغام پہنچا سکے ان کے اسلوب کے حوالے سے کئی نقادوں نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ان کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

''جب طنز کارگر ہتھیار میں تبدیل ہو جاتا ہے تو طنز کو نشتر سے تشبیہہ دی جاتی ہے تو طنز نگار کو سرجن یا جراح قرار دیا جاتا ہے اور یہی فریضہ عطاءالحق قاسمی کامیابی سے سر انجام دے رہا ہے۔اگر پاکستانی معاشرہ ہسپتال کا وارڈ ہے تو پھر ڈاکٹر عطاءالحق قاسمی ماہر سرجن ہے اور یہ کام وہ گزشتہ چالیس برس سے کر رہا ہے(۲۲)۔''

مذکورہ سفرنامے میں زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔سفرنامے میں ایک موضوع ''ابنارمل لوگ'' کے ذریعے معاشرے کے ایسے لوگوں کا خاکہ اڑایا گیا ہیں جو محفل موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں:

''یہاں میں نے سینکڑوں لوگوں سے بھرے ہوئے ایک ہال میں دیکھا کہ اسٹیج پر دو شخص چوکڑی مار کر بیٹھے تھے اور وہ لوگوں کو طبلے کی تھاپ پر آہ وزاری کر کے دکھاتے تھے ان بے چاروں کے چہرے کرب سے کھنچے ہوئے تھے اور وہ حلق سے ایسی آوازیں نکال رہے تھے جیسی آوازیں بکرے کو ذبح کرتے وقت اس کے حلق سے نکلتی ہیں۔میرے لیے زیادہ افسوس ناک امر یہ تھا کہ ان اذیت پسند ناظرین کے لیے یہ آہ و بکا مثل موسیقی کے تھی اور وہ اسے پکا راگ کا نام دیتے تھے۔مجھے یہ لوگ خاصے ابنارمل لگے!(۲۳)''

عطاءالحق قاسمی کی شخصیت اور ان کے سفرناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری ان کی ژرف نگاری اور برملا اظہار کی تخلیقی قوت کا معترف ہو جاتا ہے انھوں نے لطائف بذلہ سنجی، تحریف، رعایتِ لفظی اور مزاح کی دیگر صفات کے ذریعے سماجی مسائل کی تفہیم کی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں کہ:

''ہماری سوسائٹی کے جسم پر گزشتہ کئی دہائیوں سے نمودار ہونے والے ناسوروں جن میں معاشرتی منافقت، ذہنی مرعوبیت، اخلاقی گراوٹ، گھسے پٹے سماجی رویے، بے جا نمود و نمائش، خلق خدا کی صحت سے کھیلنے والے قصاب مارکہ ڈاکٹر، تھانہ کلچر، لوڈ شیڈنگ، ادبی سرقہ بازی، شاعرانہ سیاسی صورت حال، کلاسیکی

موسیقی، اجتماعی جہالت، شوقیہ قانون شکنی، ٹریفک کے آداب سے ناواقفیت، علاقائی وگروہی تعصّبات، ناکارہ دفتری نظام، فلموں کا مصنوعی اور مبالغہ آمیز کلچر، اختیارات کا ناجائز استعمال، خوشامد اور چاپلوسی، کمزور عقائد، فضول رسوم میں سرگشتہ لوگ، حلال وحرام کے خود ساختہ معیارات، نیکی بدی کے بندھے ٹکے تصورات، یونانی ادویات کے تیس مار خان حکماء اور حفظان صحت وایمان کی کھلم کھلا خلاف ورزی وغیرہ شامل ہیں۔ کو ایک ماہر سرجن کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ان معاشرتی مریضوں پہ ناک منہ چڑھانے یا ان کے لیے کلوروفام اور چیر پھاڑ کے بجائے نہایت محبت کے ساتھ مسکراہٹ تھراپی تجویز کی ہے(۲۴)۔''

ادب کی ہر صنف بالخصوص سفر نامہ میں خارجی عوامل ادیب کی فکر کو مہمیز دے کہ براہِ راست تخلیقی عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں سفر ناموں میں جو واقعات، مشاہدات اور تاثرات نظر آتے ہیں انھیں اسی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے مثلاً سماج میں پائی جانے والی بگاڑ کی صورتِ حال، ماضی، حال اور مستقبل کی کشمکش میں الجھے ہوئے لوگوں کی سوچ، رسم ورواج کی پابندی معاشی بدحالی، استحصال، روشن خیالی اور تضادات وغیرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور سماج کی اصلاح کا کام وہی ادیب کر سکتا ہے جو اس زاویہ نگاہ سے سماج کو دیکھتا ہے کیونکہ جب تک شعوری کاوششیں بروئے کار نہیں لائیں گے اس وقت تک سماج کو خوابِ غفلت سے بیدار نہیں کیا جا سکتا ہے اس کے لیے ادیب کا داخل ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں انسانیت کا درد ہو البتہ عطاء الحق قاسمی کی تحریر کا خاص وصف داخلیت کا عنصر بھی ہے جس سے ہم آمیز ہو کر خارجی عناصر لطیف ہو جاتے ہیں۔ تحریر کی یہ خصوصیت انھیں دیگر سفر نامہ نگاروں سے ممتاز بناتی ہے کیونکہ داخلی توانائی ہر فنکار کی تخلیق کا جوہر ہوتی ہے لہٰذا ارگرد کا ماحول ہو یا تخیل کی نامعلوم وادی مشاہدے کی قوت یا تجربے کی کسوٹی فنکار اس منبع سے رس کشید کر کے تخلیقی سطح پر اس کا اظہار کرتا ہے جو تمام ادبی محاسن سے مزیّن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کا نباض اور معاشرے کا نقیب اور سماجی اقدار کا ساختہ و پرداختہ بھی ہوتا ہے اس تناظر میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کا فن اپنی انفرادیت لیے یکتا اور یگانہ نظر آتا ہے۔

حواشی:

(۱) رؤف پاریکھ، اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۶ء)، ص ۵۶۔

(۲) شوکت اللہ خان جوہر، اُردو شاعری میں ظرافت نگاری (کراچی: الفاظ اکیڈمی نارتھ کراچی، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۰۔

(۳) فوزیہ چوہدری، شاداب موسموں کی آواز (لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۰۔۹
(۴) عطاءالحق قاسمی، شوقِ آوارگی (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۰۶۔
(۵) ـــــــــ، گوروں کے دیس میں (لاہور: مقبول اکیڈمی شاہراہ قائداعظم، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۵۱۔
(۶) ـــــــــ، دنیا خوبصورت ہے (لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۰۳۔
(۷) ایضاً، ص ۱۰۳۔
(۸) عطاءالحق قاسمی، خندِ مکرّر (لاہور: غالب پبلشرز، ۱۹۸۳ء)، ص ۹۔
(۹) ایضاً، ص ۱۶۶۔
(۱۰) فوزیہ چوہدری، شاداب موسموں کی آواز، محوّلہ بالا، ص ۱۲۱۔
(۱۱) عطاءالحق قاسمی، دنیا خوبصورت ہے، محوّلہ بالا، ص ۴۶۔
(۱۲) انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفر نامہ (لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، سن ندارد)، ص ۶۶۸۔
(۱۳) فوزیہ چوہدری، شاداب موسموں کی آواز، محوّلہ بالا، ص ۱۱۴۔۱۱۵
(۱۴) عطاءالحق قاسمی، دلّی دور است، (لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۱۹۹۵ء)، ص ۴۰۔۴۱
(۱۵) ایضاً، ص ۱۷۔
(۱۶) ایضاً، ص ۳۶۔
(۱۷) عطاءالحق قاسمی، ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ (لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۲۴۔
(۱۸) ایضاً، ص ۱۲۔۱۳
(۱۹) ایضاً، ص ۲۱۔
(۲۰) ایضاً، ص ۳۵۔
(۲۱) ایضاً، ص ۵۳۔
(۲۲) ایضاً، ص ۴۱۔
(۲۳) ایضاً، ص ۵۶۔
(۲۴) ایضاً، ص ۱۲۸۔

مآخذ:

۱۔ آغا، وزیر، اُردو ادب میں طنز و مزاح، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء۔
۲۔ پاریکھ، رؤف، اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۶ء۔
۳۔ جوہر، شوکت اللہ خان، اُردو شاعری میں ظرافت نگاری، کراچی: الفاظ مارکیٹ اکیڈمی آواز محل، نارتھ کراچی، ۲۰۱۶ء۔
۴۔ چوہدری، فوزیہ، شاداب موسموں کی آواز، لاہور: نستعلیق مطبوعات اُردو بازار، ۲۰۰۹ء۔
۵۔ سدید، انور، اُردو ادب میں سفر نامہ، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی۔
۶۔ قاسمی، عطاءالحق، خندِ مکرر، لاہور: غالب پبلشرز ملتان روڈ، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۳ء۔
۷۔ ـــــــــ، دلّی دور است، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۱۹۹۵ء۔
۸۔ ـــــــــ، دنیا خوبصورت ہے، لاہور: نستعلیق مطبوعات اُردو بازار، ۲۰۰۹ء۔

۹۔ ________، شوقِ آوارگی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

۱۰۔ ________، غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۰۷ء۔

۱۱۔ ________، گوروں کے دیس میں، لاہور: مقبول اکیڈمی شاہراہِ قائدِ اعظم، چوتھا ایڈیشن، ۱۹۹۹ء۔

صفیہ آفتاب

اُستاد، شعبۂ اُردو

جامعہ کراچی

سیّد سلیمان ندوی کے اسلوبِ نثر کی انفرادیت

ABSTRACT

The Uniqueness of Syed Sulaiman Nadvi's prose style.
By Dr. Safia Aftab, Assistant Professor, Department of Urdu, University of Karachi.

Syed Sulaiman Nadvi is considered one of those writers of Urdu who have penned significant books on religious as well as literary and academic issues. His prose style is one of the characteristic for which he is famous. The prominent features of his prose style have been discussed and analyzed in this research article. The researcher has concluded that Syed Sulaiman Nadvi's style is simple but elegant. His flowing prose beautifully captures the era of the matters and it is at the same time intelligible and comprehensive.

سید سلیمان ندویؒ کا شمار بیسویں صدی کے ان نثر نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اہم علمی ، ادبی و مذہبی موضوعات پر تصانیف تحریر کیں۔ان تصانیف کی علمی وادبی حیثیت مسلّم ہے۔ایک اور خصوصیت ان کا اسلوب ہے۔سید صاحب کے مختصر تعارف کے بعد ان کی چند تصانیف میں سے اسلوب کے نمونے یہاں دیے گئے ہیں۔

سید صاحب کی پیدائش ضلع پٹنہ ریاست بہار کے ایک گاؤں دسنہ میں ۲۳ نومبر ۱۸۸۴ء بمطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں پھلواری شریف اور پھر دربھنگہ میں پائی (۱)۔۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور یہاں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی۔یہاں مولانا فاروق چڑیا کوٹی جیسے جید عالم نے سید صاحب کی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔۱۹۰۵ء میں علّامہ شبلی نعمانی ندوہ کے باقاعدہ معتمد تعلیم ہوئے تو سید صاحب کو بہت خوشی ہوئی اور اس کا اظہار انھوں نے ایک طویل فارسی قصیدہ لکھ کر کیا (۲)۔علامہ شبلی نعمانی کی صحبت اور تربیت نے سید سلیمان ندویؒ جیسے گوہر کو وہ آب داری بخشی کہ ادب اس سے منوّر ہو گیا۔

سید صاحب کا ایک معروف علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق تھا۔نجیب الطرفین سید تھے۔روحانی لحاظ سے والد بھی درویش صفت بزرگ تھے (۳)۔اس تعلیم و تربیت کا سید صاحب کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔آپ کی تحریروں کے اکثر موضوعات مذہبی اور اسلامی نوعیت کے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''پندرہ سولہ برس کی عمر میں کانوں میں دو آوازیں دم بدم آ رہی تھیں۔ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب میں عقل و فطرت کی مطابقت کی کوشش اور دوسری علماء کو نئے زمانے کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کر کے پرانی عربی تعلیم کی از سرِ نو کی تنظیم کی تحریک جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اٹھے تھے۔اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علیگڑھ کی ایک عربی درس گاہ تھی جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی۔اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا جہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے۔کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑیں مگر میرا خاندانی ماحول اس دوسری تحریک سے متاثر تھا اس لیے اسی دوسری تحریک سے دل چسپی ہوئی اور وہ بڑھتی گئی اور پھیلتی گئی اور وہی میری زندگی کا جزو بن گئی (۴)۔''

سید صاحب محقق تھے اور محقق بھی ایسے کہ بعض دفعہ صرف ایک لفظ کی تحقیق کے لیے کئی کئی کتب خانے چھان لیتے ،لوگوں سے تحقیق کرتے اور جب تک مطمئن نہ ہو جاتے کوئی رائے قائم نہ کرتے۔یہ تو صرف ایک لفظ کی تحقیق کا ذکر